Fikr-o-Nasar (Islamabad) 5:7 (1968)
© rasailojaraid.com

دو مذہبی نظام ہائے فکر

تقلیدی اور تخلیقی

الطاف جاوید

خود تنقیدی (SELF-CRITICISM) جسے حضرت علامہ اقبالؒ نے ان الفاظ میں پیش فرمایا ہے ؎

'صورتِ شمشیر ہے دستِ قضا میں وہ قوم
کرتی ہے جو ہر زماں اپنے عمل کا حساب'

خود تنقیدی دراصل اُمم کی بقا و ترقی کے لئے ایک بے حد ضروری عمل ہے۔ اپنی کمزوریوں، خامیوں اور کوتاہیوں کا ہر دم جائزہ لیتے رہنا زندہ اور حرکت پذیر ہونے کی علامت ہے۔ قرآن حکیم نے لفظ 'استغفار' کو خود تنقیدی کے معنوں میں استعمال فرمایا ہے۔ جب ہم استغفار کرتے ہیں تو درحقیقت اپنی کوتاہیوں اور بے راہ رویوں پر خود تنقید کر رہے ہوتے ہیں۔ نبی اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے جب اپنے مشن کو مکمل کر لیا تو سورۂ نصر جو قرآن حکیم کے سلسلۂ نزول میں سب سے آخری سورت ہے، حق تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوئی جس میں ہادیٔ برحقؐ کی وفات کے بعد رہتی دنیا تک بدلتے ہوئے مختلف تاریخی ادوار میں اُمتِ مسلمہ کے استحکام و ارتقاء کے لئے جو لائحۂ عمل بتایا گیا ہے، وہ یہی خود تنقیدی کا اُصول ہے، دینِ حق میں عرب قبائل کے جوق در جوق اور قافلہ در قافلہ شامل ہونے کے بعد تسبیح، حمد اور استغفار کے اُصول تلقین فرمائے گئے۔

ذاتِ باری تعالیٰ کی تسبیح کرتے وقت دراصل ہم تشبیہہ سے تنزیہہ، کثرت سے وحدت، مقامیت سے آفاقیت، جانبداریت سے غیر جانبداریت اور مادّہ سے نُور کی طرف ذہنی سفر کرتے ہیں اور تسبیح کے ان مضمرات کا اپنی داخلی اور خارجی زندگی میں تحقق ہی غایتِ حیات ہے۔ کیوں کہ ذات یا شخصیت کی تکمیل و صلابت کا عمل جہاں محیط سے مرکز کی طرف آتا ہے۔ وہاں ادنیٰ اور محدود

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دائروں سے نکل کر اعلیٰ اور وسیع تر دائروں میں قدم بھی رکھتا ہے۔

مگر بشری حیثیت سے ہمیں کسی حقیقت یا غایت کو حاصل کرنے کے لیے تسخیرِ فطرت اور معاشری عمل کے اہتزاز سے گزرنا لابدی ہے۔ اور ہم تسخیرِ فطرت سے جن نت نئے حقائق کا انکشاف کرتے اور معاشری ارتقار سے جن اعلیٰ سے اعلیٰ منازل کا حصول عمل میں لاتے ہیں، اُن نئے حقائق اور اعلیٰ منازل کی حیرت انگیز نیرنگیوں اور بے پناہ عظمتوں سے ایک طرف تو ہمارے قلوب حمدالٰہی کے نغمات سے بھر جاتے ہیں، مگر دوسری طرف فطری حقائق کے انکشاف سے جو قوت ہمارے ہاتھ آتی ہے اُس کے صحت مند استعمال اور معاشری ارتقار کے ایک ادنیٰ مرحلہ سے اعلیٰ تر مرحلہ تک رسائی کے لئے ہماری حیاتِ ذہنی اور عمرانی میں جو انتشار اور عدم استحکام پیدا ہوتا ہے، اُسے سالمیت اور استقلال میں بدلنے کا راستہ سیدھا اور یکسانیت کا حامل نہیں ہوتا۔ یہ راستہ اَن گنت غلطیوں، کوتاہ نظریوں اور مبالغہ آمیزیوں سے بھرپور ہوتا ہے، لہذا ہمارے پاس استغفار یا خود تنقیدی کا ہی ایک ایسا ہتھیار ہے جس کے استعمال سے ہم ہر نئے دَور کی معاشری اور نظری ذمہ داریوں سے اپنے عمل کی خامیوں اور فکری نارسائیوں کے احتساب سے عہدہ برآ ہو سکتے ہیں۔

لہذا خود تنقیدی سے جن فکری اور نظری استقام، نفسی اور تعلیمی واماندگیوں اور معاشرتی بے قاعدگیوں پر ہمیں اطلاع ملے تو ہمارا فرض ہے کہ اُن پر چراغ پا ہونے اور تلخ لہجہ اختیار کرنے کی بجائے اپنے ذہن کی تخلیقی صلاحیتوں سے کام لیتے ہوئے، اُن کی تعمیری اصلاح کرنے کی کوشش کریں ———— اب میں اپنے اصل موضوع پر آتا ہوں۔ عام طور پر مذہب کے بارے میں دو نظام ہائے فکر ہوتے ہیں۔ ایک تقلیدی اور دوسرا تخلیقی۔ بدقسمتی سے ہمارے ہاں اکثر علمار نے اوّل الذکر نظامِ فکر کو اپنا رکھا ہے، اور اُس پر وہ سختی سے قائم ہیں اور قائم رہنا چاہتے ہیں۔

مجھے یہاں اس حقیقت کا اعتراف کرنا چاہیئے کہ ہمارے یہ علمار اسلام ہی تھے، جن کی مخلص سعی و جہد کی برکت سے دینِ حق اپنی روایتی شکل میں آج ہمارے پاس موجود ہے۔ یہ مذہبی دارالعلوم ہی ہیں جنہوں نے ہمارے قدیم مذہبی ورثہ کو آج تک محفوظ رکھا ہے۔ دن میں پانچ وقت حیَّ علی الفلاح کی گونجتی ہوئی جانفزا آواز، یہ مساجد، یہ درس و تدریس کا ذوق و شوق، یہ قرآن حکیم کے حفاظ کی تیاری اور اسی طرح کے دیگر مذہبی اعمال کی انجام دہی انہی عالمانِ دین اور اُن کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دارالعلوموں کی طفیل قائم ہے۔

اس اعتراف کے باوجود اس بات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ پچھلی چھ صدیوں سے اِن علومِ مذہب اور اداروں میں جمود اور زوال پذیری اپنے قدم جما چکی ہے۔ آج مذہبی فکر و عمل اپنی نوعیت میں تخلیقی ہونے کی بجائے تقلیدی بن چکا ہے۔

ہماری یہ حالت اور بھی قابلِ افسوس ہو جاتی ہے جب اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ ہم ایک ایسی کتابِ مقدس کے حامل ہیں جو کلماتِ الٰہی کے لاتناہی اور غیر مختتم ہونے کی تعلیم دیتی ہے "اگرچہ روشنائی کے کئی سمندر اور روئے زمین کے تمام درختوں کی اقلام انہیں لکھتے ہوئے ختم ہو جائیں" یہ کلماتِ الٰہی وجود، اُس کے مظاہر اور اُن کے مضمرات کی شکل میں ہمارے سامنے ہیں۔ یہ حق تعالےٰ ہی ہے جو وجود اور اُس کے مظاہر کا اوّل و آخر بھی ہے اور ظاہر و باطن بھی۔ یہ اللہ ہی ہے جس کا نور سماوات وارض میں پھیلے ہوئے مظاہرِ وجود کی صورت میں ہم پر عیاں ہو رہا ہے۔ اور یہ وجود مطلق ہی ہے جو ہر آن اپنی نئی شان میں جلوہ گر رہتا ہے۔

لہٰذا قافلہ وجود کی رفتار و حرکت میں کہیں بھی اور کسی بھی لمحہ ٹھہراؤ کو تسلیم کرنا قرآن کی حکمتِ بالغہ کے خلاف ہوگا۔ کیوں کہ قرآن اپنے فکری عمل میں جمود اور رجعت پسندی کو کسی شکل میں بھی قبول نہیں کرتا۔

چوں کہ زمان و مکان کے اس محسوس مرحلہ میں کوئی شے یا شخصیت مکمل نہیں ہے۔ لہٰذا تنقید سے گھبرانے کی بجائے اُسے لبیک کہنا چاہیئے۔ کیوں کہ تنقید ہی ایک ایسی چیز ہے، جس کے ذریعہ ہم اپنے انفرادی اور ملی وجود اور اُس کے تقاضوں کو مکمل کر سکتے ہیں۔ تنقید بدصورتی کی تہہ میں چھپے ہوئے حُسن کو کرید کر باہر لانے کا نام ہے۔ تنقید ایک آئینہ ہے جس میں ہم اپنے چہرے کے داغ بھی دیکھ سکتے ہیں اور اپنے حسن کو بھی۔ تنقید بدن کے اُس حصہ کی نشان دہی کرتی ہے جہاں بیماری اپنا قبضہ جما چکی ہے اور عیاں ہے کہ طبقۂ علماء میں بھی پانچوں اُنگلیاں ایک جیسی نہیں ہیں۔ تنقید عمل کے لئے مہمیز کی حیثیت رکھتی ہے۔

اور اس میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں کہ تنقید کرنے والا ذہن آسمانی نہیں ہوتا۔ وہ بھی ملی وجود کا ایک حصہ ہوتا ہے۔ ملت کی تونمندی یا کمزوری سے وہ بھی متاثر ہوتا ہے، مگر فرق صرف

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

آتنا ہے کہ وہ بے لوث، غیر جانب دار اور مفاد پرستی سے الگ ہو کر جب مطالعہ کرتا ہے تو اس قابل ہو جاتا ہے کہ معروضی حقیقت میں اگر کہیں جھول آ چکا ہے تو اُسے درست کرنے کی کوشش کی جائے۔

یہ سمجھنا بھی شدید غلطی ہے کہ علمائے مذہب وجود ملّی سے ماورا وجود رکھتے ہیں۔ یہ بزرگ شخصیتیں ملّت کے وجود کا ایک قابلِ قدر حصہ ہیں، لہٰذا اُن پر تنقید دراصل اپنے آپ پر اور پورے ملّی وجود پر تنقید کرنے کے مترادف ہے۔ کیوں کہ جسم کے ایک حصہ کا بگاڑ پورے جسم کی صحت اور قوت کو خطرے میں ڈال دیتا ہے۔ غلطی اور کجی ہر عضو میں پیدا ہو سکتی ہے۔

لہٰذا حق تعالیٰ کی نئی شان اور اُس کے تقاضوں کے مطابق اگر مذہبی علوم اور اداروں میں مناسب تبدیلیاں عمل میں لانے کا مشورہ دیا جائے تو اُس پر چیں بجبیں ہونے کی بجائے، ہمدردانہ غور و فکر کرنا ہی مومنانہ فراست کی دلیل ہے۔

مذہبی تقلیدی نظام سے مراد کوئی فرد یا افراد کا مجموعہ نہیں ہے بلکہ یہ ایک فکری اور تعلیمی رویہ ہے جو مذہب اور مذہبی مسائل کے متعلق اختیار کیا جاتا ہے اور اس طرح تصورات و عقائد کا ایک نظام مرتب کرتا ہے، جو دوسرے نظاماتِ فکر سے اپنی ماہیت میں منفرد ہوتا ہے۔ اس نظام کا مفہوم دراصل نظامِ حکمت کے مفہوم کے برعکس معانی کا حامل ہے، اور نظامِ حکمت سے مراد فلسفہ اور سائنس دونوں ہیں۔ کیوں کہ حقیقتِ اولیٰ کی تلاش میں یہ دونوں آزاد اور تخلیقی تحقیق سے کام لیتے ہیں اس لئے یہ اپنی تلاش کے دوران پہلے سے مقرر شدہ اور بندھے ٹکے منہاج پر نہیں چلتے بلکہ اپنا راستہ اور نظامِ عمل خود مقرر کرتے ہیں۔ یہ معاشرہ میں رائج الوقت عقائد اور رسوم و اعمال کی عقلی اساس پر جرح و تنقید کرتے ہیں تاکہ معاشرتی عمل اپنے ارتقائی مراحل آسانی سے طے کر سکے۔

ہم جس عہد میں سانس لے رہے ہیں، اس عہد کی عقلیت استقرائی، تخلیقی اور معاشرتی عقلیت ہے جو عقلِ قیاسی سے اپنی کیفیت اور مافیہ دونوں میں بالکل مختلف ہے، کیوں کہ عقلِ قیاسی کے نظامِ فکر میں حقیقت صرف بسیط، لامکانی و زمانی، مطلق، واجب اور کلی تصور کی جاتی ہے مگر عہدِ حاضر کی استقرائی، تخلیقی اور معاشرتی عقلیت حقیقت کے اس تصور کو غیر مکمل اور یک طرفہ سمجھتی ہے۔ اُس کے نزدیک مذکورہ اقدار کے ساتھ جب تک مرکب، زمانی و مکانی، اضافی اور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ممکن و جزئی کے تصورات کو شامل نہ کیا جائے حقیقت کی کامل توجیہہ نہیں ہو سکتی۔

حقیقت ایک نامیاتی کُل ہے جو اِن دونوں پہلوؤں پر مشتمل ہے۔ یہ ایک دوسرے کے متضاد ہوتے ہوئے بھی اپنے کُل کے اندر پوری طرح متحد ہوتے ہیں۔ حکمت وجود اور اُس کے مظاہر کو وقت کے سیلان میں واقع تسلیم کرتی ہے۔ وقت کے سیلان کے باہر کسی مظہر کو نہیں مانتی۔ چوں کہ فطرت، معاشرہ اور ذہن کا ہر مظہر وقت کے سیلان میں واقع ہے، اِسی لئے اس کی اساسی قدر تغیّر، حرکت اور ارتقا ہے۔ حکمت حیاتِ قومی کے نشو و نما کے لئے ایسی ہی ضروری ہے، جیسے پودے کے لئے پانی۔ ترقی پذیر اقوام اپنے فکر و عمل کی اساس حکمت پر رکھتی ہیں۔ حکمت ہمیشہ حال سے استقبال کی طرف قدم بڑھاتی ہے اور افکار و قوانین کے کسی ایسے نظام کو قبول نہیں کرتی جسے ماضی میں پہلے سے تیار کر لیا گیا ہو۔ حکمت وہ گنجِ گراں مایہ ہے، جسے تمام آسمانی ہدایتیں اپناتی رہی ہیں بلکہ اُن کی تلقین کرتی رہی ہیں۔ قرآنِ حکیم اسے خیرِ کثیر کے عظیم لفظ سے یاد کرتا ہے۔

اس کے برعکس مذہبی تقلیدی نظامِ فکر عام طور پر عقلِ قیاسی پر اپنی اساس رکھتا ہے اور اسی سے مسائلِ حیات کے متعلق سوچنے اور اُنہیں حل کرنے کی تکنیک بھی حاصل کرتا ہے۔ یہ وجود، فکر اور اُن کے مظاہر کو وقت کے سیلان سے باہر واقع تصور کرتا ہے۔ اس لئے انبیاء اور ان کے ممتاز متبعین کے وقتی فیصلوں کو دائمی حیثیت دے دیتا ہے۔ یہ حال سے ماضی کی طرف لوٹتا ہے اس لئے یہ حرکت کے تخلیقی نہیں، میکانکی تصور کو اپنا لیتا ہے۔ یہ جمود، روایت پرستی اور متشدد قدامت پسندی کا قائل اور تغیّر و ارتقا کا دشمن ہوتا ہے۔ مُردہ اور زوال پذیر طبقات اسے اپنا سرمایۂ حیات بناتے ہیں اور اس طرح موت اور ظلمت کی وادیوں کی طرف سرگرم سفر رہتے ہیں۔

یہ مذہبی تقلیدی نظام صرف مسلمانوں سے ہی مخصوص نہیں ہے بلکہ یہ زرتشتیوں کے مُوبد، یہودیوں کے ربّی، بدھوں کے بھکشو، ہندوؤں کے برہمن اور عیسائیوں کے پادریوں پر مشتمل ہے۔ چوں کہ یہاں تخاطب محض مسلمانوں سے ہے اس لئے تحریر کا موضوع صرف مسلم مذہبی دانش ہے۔ اس مذہبی تقلیدی نظام کے استقرائی مطالعہ سے اس کی چند تاریخی خصوصیات سامنے آتی ہیں۔ یہ خصوصیات تاریخِ عالم میں ہر مذہب کی مذہبی قیادت کے ساتھ وابستہ رہی ہیں۔

اگر اِن خصوصیات کا ایک مختصر سا جائزہ لیا جائے تو اس کے حقیقی خد و خال کو پہچاننے میں کافی مدد

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ملے گی۔

پہلی خصوصیت عقیدہ پرستی

عقیدہ سے مراد فطرت، سماج اور شعور کے متعلق وہ تمام بنیادی اُصول و قوانین ہیں، جو کسی مذہب کے نظامِ حیات کی اساس بنتے ہیں۔ عقائد اس لیے تشکیل پاتے ہیں کہ وہ عمل کے لئے مشعلِ راہ کا کام دیں۔ عقائد و نظریات عمل کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے وجود میں آتے ہیں۔ عقیدہ اور عمل میں ایک نامیاتی ربط و تعلق ہوتا ہے۔ عقائد و نظریات جہاں ذہن میں یقین پیدا کرتے اور اپنے حاملین کو عمل کا راستہ دکھاتے ہیں اور عملی راستہ کی پیچیدگیوں اور گمراہیوں سے بچنے کے لیے نشیب و فراز پر روشنی ڈالتے ہیں۔ وہاں وہ خود عمل کی کسوٹی پر کس کر اپنے آپ کو مکمل کرتے اور پُرمایہ بناتے ہیں۔

عقیدہ یا نظریہ کا اصل کام اپنے آپ کو عمل میں تحویل کرنا ہوتا ہے۔ جو عقیدہ اپنے آپ کو عمل میں نہیں بدلتا، وہ مُردہ لاش کی حیثیت رکھتا ہے۔ قرآن حکیم نے نظریہ یا عقیدہ کے عمل سے باہمی ربط و تعلق کی نوعیت کو اس طرح بیان فرمایا ہے:۔ یا ایھا الذین اٰمنوا لم تقولون مالا تفعلون ہ کبر مقتاً عند اللہ ان تقولوا مالا تفعلون۔ (الصف) عقیدہ کو عمل میں بدلنے کی جدوجہد ہی وہ معیار اور محک مہیا کرتی ہے جس پر مختلف عقائد کی افادیت اور صداقت کو جانچا جا سکتا ہے۔

عقیدہ پرستی سے مراد یہ ہے کہ عقائد و نظریات کو اُن کے الفاظ میں ٹھیک طرح سے یاد کر لینا، اُنہیں طوطے کی طرح زبانی رٹ لینا، نہ تو خارجی حقیقت سے اُن کا تعلق پیدا کرنا اور نہ ہی معاشرتی عمل سے۔ اور بغیر کسی مزید سوچ بچار کے اِن عقائد کو ہر معاشرتی اور نفسی مرض کی دوا سمجھ لینا۔ عقیدہ پرستی عقیدہ اور عمل کے تعلق میں کوئی گہرا منطقی رشتہ قائم نہیں کرتی اور عقیدہ یا نظریہ کو عمل میں بدلنے کی کوئی ضرورت محسوس نہیں کرتی۔ اُس کے لیے بس عقیدہ کی نوک پلک درست کر کے اُسے دہراتے رہنا ہی سب کچھ ہے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا مقصد محض عقیدوں کی تلقین کرنا ہی نہیں تھا بلکہ معاشری، نفسیاتی اور فکری زندگی کے دائروں میں اُن کا عملی تحقق مقصود تھا۔ عقائد تو حضرت ابراہیم علیہ السلام بلکہ اُن سے بھی پہلے سے چلے آ رہے تھے، مگر حیاتِ معاشرہ سے جب بھی اُن کا تعلق ٹوٹ جاتا تو کوئی نہ کوئی نبی مبعوث ہو کر اس تعلق کو پھر سے استوار کر دیتا تھا۔ کیونکہ عقائد کا زبانی رٹ لینا یا دوسروں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کو ذہنی طور پر اُن کا قائل کر کے اپنے گروہ میں شامل کر لینا تو حیاتِ انسانی کے تزکیہ وارتقار کے لئے کافی نہیں ہوتا۔

انبیار جس جماعت کی تنظیم کرتے تھے ، اس جماعت کا مقصد ایسے افراد کو جمع کرنا نہیں تھا ، جو اُن کے تلقین کردہ عقائد کو محض زبانی طور پر تسلیم کرلیں۔ بلکہ ہر نبی کو ایسی جماعتوں سے واسطہ پڑتا رہا ہے جو پہلے سے کسی مبعوث شدہ نبی کے نظامِ عقائد پر بن چکی تھیں ، اور انہیں جماعتوں نے بعد میں آنے والے نبی کی بعثت اور تعلیمات کی شدید مخالفت کی۔ کیوں کہ نئے نبی کی جدوجہد سے اُن جماعتوں کے ذاتی مفاد اور معاشرتی مرتبہ کو زبردست نقصان پہنچتا تھا۔ بلکہ ایسے افراد پر مشتمل جماعت کا قیام مقصود تھا۔ جو اُن کے نظامِ عقائد کو مان کر اُن کی منشار کے مطابق معاشرتی زندگی کو بدلنے کی جدوجہد کریں۔

لہٰذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ ساری انسانی تاریخ مذہبی تقلیدی پیشوائیت کی عقیدہ پرستی اور انبیار کے انقلابی عمل اور تعلیمات کی باہمی آویزش کی تاریخ ہے۔

مسئلہ کی کامل تفہیم کے لئے ایک مثال پر غور کر لینا مفید ہوگا۔ عقیدۂ توحید کو ، جو تمام مذاہب کی تعلیمات میں بنیادی حیثیت رکھتا ہے ، ماننے سے مراد محض یہی نہیں کہ خالقِ کائنات کو واحد تسلیم کر لیا جائے۔ بلکہ منشار الٰہی یہ ہے کہ اس عقیدہ کے مضمرات یعنی وحدتِ حیات ، وحدتِ انسانیت اور وحدتِ ادیان کو معاشرتی سطح پر محسوس شکل میں حاصل کیا جائے اور ہر ایسی قوت اور طاقت کو راستہ سے ہٹا دیا جائے ، جو ان مضمرات کو حاصل کرنے میں مانع ہو۔ تاکہ کرۂ ارض پر بسنے والے تمام انسان الخلق عیال اللہ کے مصداق بن جائیں۔

پھر یہی نہیں کہ عقیدۂ توحید کے مضمرات کے خارجی زندگی میں تحقق سے محض معروضی زندگی ہی تبدیل ہو جاتی ہے بلکہ خارجی زندگی کو تبدیل کرنے کے لئے جب ایک فرد جدوجہد کا آغاز کرتا ہے۔ تو اُس کی ذاتی نفسیات میں بھی تبدیلیاں واقع ہونے لگتی ہیں۔ اور بتدریج اُس کی نفسی اور ذہنی حیات میں ایک انقلاب ظہور پذیر ہونے لگتا ہے۔ اب وہ دوسرے مذاہب اور نظاماتِ افکار سے نفرت کرنے کی بجائے اُن میں صداقت کے عنصر کو تلاش کرنا شروع کر دیتا ہے۔ کیوں کہ اُس کا عقیدہ ہے کہ حیاتِ انسانی کا منبع و ماخذ واحد ہے۔ لہٰذا حیاتِ انسانی کرۂ ارض کے کسی بھی خطہ میں پائی جاتی ہو اور کسی بھی ہیئت و تنظیم میں ہو ، بنیادی طور پر واحد ہے۔ بُعدِ مکانی اور تہذیبی و تمدنی اختلافات عارضی علتیں ہیں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

حقیقی نہیں، اور اس نفسیاتی ارتقاء کے دوران ایک مرحلہ ایسا آتا ہے کہ جب وہ حضرت ابن عربی کے ہم زبان ہوکر پکار اُٹھتا ہے :-

لقد کنت قبل الیوم انکر صاحبی — اِذا لم یکن دینی الی دینہ دانی

وقد صار قلبی قابلاً کل صورۃ — فمرعی لغزلان ودیر لرھبان

وبیتٍ نیران وکعبۃ قاصدٍ — والواح توراۃ و مصحف قرآن

ادین بدین الحب انی توجہت — رکائبہ فالحب دینی وایمانی

(آج کے دن سے پہلے میرا یہ حال تھا کہ جس ساتھی کا دین مجھ سے نہ ملتا، میں اُس کا انکار کرتا اور اُسے اجنبی سمجھتا۔ لیکن اب میرا دل ہر صورت کو قبول کرتا ہے۔ وہ چراگاہ بن گیا ہے غزالوں کی اور دیر راہبوں کے لئے۔ آگ پوجنے والوں کا آتش کدہ اور حج کا قصد کرنے والوں کا کعبہ۔ تورات کی الواح اور قرآن کا صحیفہ۔ میں اب مذہبِ عشق کا پرستار ہوں۔ عشق کا قافلہ جدھر بھی مجھے لے جائے، میرا دین بھی عشق ہے۔ میرا ایمان بھی عشق ہے۔)

اس طرح نہ صرف وہ اس دنیا میں ہی ایک نیا انسان بن جاتا ہے بلکہ اُس کی داخلی نفسی زندگی میں پیدا ہونے والی تبدیلیاں حیاتِ اُخروی میں پہلے درجہ میں اُس کے نسمہ پر۔ دوسرے درجہ میں اُس کی روحِ ملکوتی پر۔ اور تیسرے درجہ میں اُس کی ذاتِ بحت پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ اور بالآخر وہ اپنی نوع کے امام سے جا ملتا ہے۔ اور امام نوع کے ساتھ متحد ہونے سے وہ براہِ راست ذاتِ باری تعالیٰ کی غیر مختتم تجلیات کے جلوہ میں آجاتا ہے اور اس طرح وہ لقاءِ رب اور رویت باری تعالیٰ کی نعمتِ عظمےٰ سے سرفراز ہوجاتا ہے جو حیاتِ انسان کا مقصودِ اُولیٰ ہے۔

لہذا اس مثال سے یہ بات پوری طرح واضح ہوجاتی ہے کہ عقائد اگر عمل میں تبدیل نہیں ہوتے تو وہ بے جان لاشیں ہیں، جن کے رکھ رکھاؤ کے لئے تو کچھ کیا جاسکتا ہے مگر اُن میں حیات تازہ نہیں پیدا کی جاسکتی۔ اور نہ وہ حیاتِ انسانی کے تکمیل و تزکیہ کے لئے کوئی عمیق تبدیلی لا سکتے ہیں۔

اور پھر یہ عقیدہ پرستی ہی ہے جس کی وجہ سے تمام مذاہب میں نہ صرف باہمی طور پر شدید اختلافات پیدا ہوئے بلکہ یہ اپنی داخلی تنظیم میں بھی ٹکڑے ٹکڑے ہوگئے۔ کلّ حزبٍ بما لدیھم فرحون (قرآن حکیم)۔ اگر اس تفریق و انتشار کا کوئی علاج ممکن ہوسکتا ہے تو یہ صرف یہی کہ عقیدہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے ربط و تعلق کو از سرِ نو معاشرہ کے ارتقائی اور تخلیقی عمل سے قائم کر دیا جائے اور اسی معیار پر ہر گروہ اور ہر مذہب کے اعمال کو جانچا اور کسا جائے اور اس طرح اُن تمام اعمال و عقائد کو الگ کر دیا جائے جو معاشرتی عمل اور تزکیہ نفس کے راستہ میں حارج ہیں اور صرف اسی طرح ہم مذاہب عالم کے اتحاد کی بنیادوں کو پھر سے اُستوار کر سکتے ہیں۔ جس سے مذاہبِ عالم ایک دوسرے سے الگ الگ متحارب و متخاصم گروہوں کی حیثیت ختم کر کے فطرت کے ایک ہی تخلیقی و ارتقائی عمل کی مختلف کڑیاں بن جائیں گے، جو اپنی غایتِ اولیٰ کو حاصل کرنے کے لئے ازل سے سرگرمِ عمل ہے۔

دوسری خصوصیت ہیئت و رسم پرستی

جس طرح مذہبی تقلیدی نظام میں عقیدہ کی نوک پلک درست کرتے رہنے، اُسے طوطے کی طرح رٹ لینے اور پھر مناسب مواقع پر اُس کو چسپاں کرنے سے اُسے زندگی کے ہر مسئلہ کو حل کرنے کی کلید سمجھ لیا جاتا ہے۔ اسی طرح عبادات و اعمال کی ہیئت یعنی ارکان و رسوم ہی کو جس میں انہیں ادا کیا جاتا ہے، سب کچھ تصور کر لیا جاتا ہے۔ چاہے وہ عمل یا عبادت اُس نصب العین یا غایت کو پورا کرے یا نہ کرے، جس کے لئے اُسے وضع کیا گیا ہے۔

ہیئت یا رسم کا منصب یہ ہوتا ہے کہ وہ اُس غایت یا معنیٰ کی حفاظت کرے، جس کے لئے اُسے وضع کیا گیا ہے۔ بذاتِ خود ہیئت یا رسم کی ادائیگی مقصود نہیں ہوتی۔ اگر ہیئت و رسم کے ظاہری ڈھانچہ کے رکھ رکھاؤ کو ہی نصب العین بنا لیا جائے اور سمجھ لیا جائے کہ رسوم و ارکان کو اُن کے قواعد کے مطابق بجا لانا ہی کافی ہے۔ تو معنیٰ یا غایت کا حصول ممکن نہیں رہتا۔ غایت اور معنیٰ تو تبھی حاصل ہوگا، جب ان تمام اعمال کا مقصد اس کا حصول قرار دے دیا جائے اور رسوم و ہیئت کی صحت مندی کا معیار معنیٰ یا غایت کے حصول کو تصور کیا جائے۔

ہیئت یا رسم سے معنیٰ کا حاصل کرنا ایک شعوری عمل ہے اور شعوری عمل ہمیشہ ارادی ہوا کرتا ہے۔ جب تک معنیٰ یا غایت کو حاصل کرنے کے لئے شعور و ارادہ کے ساتھ ہیئت یا رسم کی ادائیگی نہ کی جائے گی اس وقت تک اُس کا حصول ناممکن ہے۔

مثلاً صلوٰۃ کی غایت کی وضاحت کرتے ہوئے قرآن حکیم نے بتایا ہے کہ یہ فحش و منکر باتوں سے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بچاتی ہے۔ اور تعلق باللہ کو قائم کرتی ہے۔ مگر ہیئت و رسم پرستی کے مرض میں گرفتار ہونے کی وجہ سے ہمارے بیشتر علماء اور عام مسلمانوں کے نزدیک صلوٰۃ کی صحتِ ادائیگی اور حق تعالیٰ کے نزدیک اُس کی قبولیت کے لئے فحش و مُنکر سے اجتناب اور تعلق باللہ کو شرط قرار نہیں دیا جاتا۔ بلکہ ہاتھوں کا زیرِ ناف یا سینے پر باندھنا یا کھُلے چھوڑ دینا، آمین بالجہر کہنا یا خفی، فاتحہ خلف امام پڑھنا یا نہ پڑھنا اور ایسے ہی دیگر ظاہری اعمال و رسوم کو بجالانے پر نہ صرف زور دیا جاتا ہے بلکہ ان ظواہر کے اختلاف پر فساد بھی برپا کیا جاتا ہے۔ چوں کہ مذہبی تقلیدی نظام نے نماز پڑھنے والوں کو اس کی غایت اور مقصدیت سے آگاہ ہی نہیں کیا لہذا نتیجہ یہ ہے کہ خود نماز ادا کرنے والا اپنے آپ کو اس قرآنی معیار یا شرط کا پابند نہیں سمجھتا بلکہ اندھا دھند میکانکی طور پر چند حرکات بجالانے کو ہی نجاتِ اُخروی کے لئے کافی تصور کر لیتا ہے۔

یہی حال وضو کا ہے۔ برس ہا برس تک وضو کرتے رہنے سے صاحبِ وضو کے نفس میں طہارت و پاکیزگی کی قدر راسخ نہیں ہوتی، وہ صرف وضو کے ظاہری شرائط کو بجالانا ہی مقصودِ وضو تصور کر لیتا ہے۔

اسی ہیئت و رسم پرستی کا ہی نتیجہ ہے کہ ازمنہ وسطیٰ کے معاشرہ کے مقابلہ میں آج کے معاشرہ کی بناوٹ اور ترکیب میں بنیادی اور واضح تبدیلی آجانے کے بعد بھی ہمارا مذہبی طبقہ زکوٰۃ کی شرح کو تبدیل کرنا بدعت و نفاق تصور کرتا ہے۔ اس متشدد رسم پرستی سے چاہے زکوٰۃ کا ادارہ ہی ختم ہو جائے جیسا کہ عملاً ہو رہا ہے مگر اُس میں کسی قسم کی تبدیلی منظور نہیں کی جاتی۔

اس نظام کی رُوح چوں کہ تقلیدی ہوتی ہے تحقیقی اور تخلیقی نہیں، اس لئے عقیدہ کا صرف زبانی اقرار کر لینا اور رسوم و ارکان کو میکانکی طور پر ادا کر لینا ہی نجاتِ اُخروی کے لئے کافی سمجھ لیا جاتا ہے اور ان میں کسی قسم کی تبدیلی کو برداشت نہیں کیا جاتا، اور انہیں بحالہ رکھنے پر اصرار ہوتا ہے، کیوں کہ تبدیلی کو تسلیم کرنے کا معنیٰ ہی ہے کہ میکانکیت کی بجائے تخلیقیت اور تحقیق کو تسلیم کر لیا گیا ہے۔ اور تخلیق و تحقیق کو بطور اُصول کے تسلیم کرنے کا مفہوم یہ ہے کہ مذہبی ذہن نے اپنی قائدانہ حیثیت سے خود ہی ہاتھ اُٹھا لئے ہیں اور جدید ذہن اور نئے تقاضوں کی اہمیت کو تسلیم کر لیا ہے اور یہ بات تو عیاں ہے کہ وہ کسی طرح بھی اس کے لئے تیار نہیں ہو سکتا ہے۔ کیونکہ یہ اُس کے وجود کی نفی کے مترادف ہے۔ (مسلسل)

© rasailojaraid.com